از:- پروفیسر مرزا محمد منوّر

آخری قسط

علّامہ اقبال اور کتابِ زندہ

انسان محض مادی وجود نہیں، وہ روح و مادّہ کی یکجائی کا مظہرِ جمیل ہے۔ لہذا اس کی بدنی اور روحانی دونوں طرح کی تربیت اور پرورش ضروری ہے۔ اگر محض ایک ہی جانب پلڑا چڑھے تو آدم اس میزانِ اعتدال سے محروم رہ جاتا ہے جس کے بغیر وہ صحیح معنوں میں اپنی تکمیل نہیں کر سکتا۔ روح اگر مادّے کی بالیوں کھیئے یا بدن کے مطالبات کی غلام عاجز ہو کر رہ جائے تو آدم کی منزل خود آگاہی اس سے ہمیشہ دور ہی رہے گی۔ خود آگاہی تو بیداری روح ہے جس کا مطلب ہے روح کا مغلوب محکوم نہ ہونا بلکہ اس کے برعکس غالب و حاکم ہونا۔

آج کے دور کا اجتماعی مزاج مادہ پرستی ہے۔ آدم مٹی سے بنا لہذا مٹی کی کے قرب میں اسے سہولت محسوس ہوتی ہے۔ جسم کی راحت وہی مٹی کے قرب کی راحت ہے۔ مٹی کی سطح سے روح کا اوپر کی طرف اُٹھنا اور بدن کو تعاون کا عادی بنانا بڑا مشقّت طلب سفر ہے۔ مقالے کے آغاز میں بالفاظ حضرت علامہ اور بحوالۂ آیاتِ الٰہی بتایا گیا ہے کہ آدم کو اوپر کی طرف جانا ہے مشقت اٹھا کے جانا ہے۔ مادّے کی پستی سے روح کی بلندی تک کا سفر بڑا کٹھن مرحلہ ہے۔ چنانچہ جب بھی آدم کو مادی راحت کی خواب گیں کیفیت سے جگانے کی کوشش کی جائے تو وہ لے اپنے حق میں عداوت جانتا ہے اور لڑ پڑتا ہے۔ انفرادی زندگی میں بھی اس کا ردِ عمل یہی ہے اور اجتماعی حیثیت میں بھی۔ لہذا ایسی تمام عادتیں اور خصلتیں جو روح کو (بلکہ ساتھ ہی بدن کو بھی) کھا جائیں ترک کر دینی چاہئیں۔ اس جانکاہ و تن فرسا کیفیت کے سامنے میں ہر بیانے تمدن)

آجاتی ہے۔ مگر ناآگاہ اور ناخودشناس آدم کیلئے تا یہی تو زندگی ہے۔ بری زندگی کی مصلحتیں جائز و ناجائز کے فرق کو ملحوظ نہیں رکھتیں۔ ہر وہ منفعت جو مادی راست کے وسائل مہیا کرے وہ ٹھیک ہے۔ حتیٰ کہ خود حکومتیں انہی اجتماعی مصلحتوں کے پیش نظر ناجائز اور آدم کش مادی ذرائع آمدنی کی پشت پناہی کرنے لگتی ہیں۔ خواہ وہ آمدنی جوئے کی آمدنی ہو اور خواہ شراب کے کاروبار کی آمدنی ہو، خواہ سود کی کمائی یا اس کمائی پر ٹیکس ہو۔۔۔ وہی تضاد جس پر مبنی ہر دین کی بنیادی تعلیم غلط انفرادی اور اجتماعی رویّے سے ٹکراتی رہی ہے۔ اسلام کی وہ صورت جو شریعت محمدی صلّی اللہ علیہ وسلّم کہلاتی ہے، تمام سابقہ ادیان کی آخری ترقی یافتہ صورت ہے اور مادی مصالح کے باب میں اسلام کے رویّے کی روح حضرت عمر بن عبدالعزیز کا وہ قول معروف ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو ہادی بنا کے بھیجا تھا نہ کہ ٹیکس کلکٹر۔

انسان کے لیے خیر کیا ہے اور شر کیا ہے؟ کیا اس مسئلہ خیر و شر کا فیصلہ انسان خود اپنی دانش کے سہارے کر بھی سکتا ہے؟ یہ مسئلہ یورپ والوں نے فلسفے کے کھاتے میں ڈال دیا۔ یہی کچھ قدیم فلاسفہ کر رہے ہیں۔ مگر یہ مسئلہ فلاسفہ کے بس کا روگ نہیں۔ انسان اپنا خالق خود نہیں، وہ اپنے امکانات اور اپنی حدود سے بخوبی آگاہ ہو ہی نہیں سکتا، خالق خدا ہے اور خالق ہی اپنی مخلوق کی ہمہ نوعی حیثیت کو بخوبی جانتا ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے: "اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ" (کیا وہ نہیں جانتا جس نے پیدا کیا؟) لہٰذا خیر اور شر کا مسئلہ احکامِ الٰہی کی روشنی میں حل ہونا چاہیئے۔ خدا کی ہدایت ہی اس باب میں معیار ہے۔ جن جن کاموں کے کرنے کا حکم ملا ہے وہ خیر ہیں اور جن جن امور سے منع کیا گیا ہے وہ شر ہیں۔ عباس محمود العقاد لکھتے ہیں۔

"مکارم اخلاق کی بھرپور معیاری مقیاس کا مصدر وحی سماوی ہے جو آدمی کو ارضیت سے بلند کر دیتی ہے" [1]

---

[1] حقائق الاسلام و اباطیل خصومہ۔ ص ۲۷۱

آدمی جتنا ارضیت سے قریب ہے اتنا انسانی اعتبار سے غیر ذی حیات ہے۔ قرآن نوعِ آدم کو مٹی سے اٹھا کر آسمان کی طرف لے جاتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ امر خدائے واحد پر ایمان و یقین کے بغیر عمل میں نہیں آسکتا۔ جب آدمی اپنے مقام کو پہچان لیتا ہے تو پھر اس پر عیاں ہو جاتا ہے کہ اس کی گذرگاہ کیا ہے، مرحلے کیا ہیں اور منزل کونسی ہے، پھر اسے غیر خدا کی محبت اپنا قیدی نہیں بنا سکتی۔ وہ ہر مخلوق کی اسیری سے اور خصوصاً مادی تقاضوں کی گرفت سے آزاد ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ اپنی کسی مِلک کا مملوک نہیں ہوتا، وہ مالک ہوتا ہے، اور مالک بھی ایسا جو جانتا ہو کہ اس کے جملہ مملوکات اللہ ہی کی امانت ہیں۔ وہ بوریا پر ہو تو جب بھی شہنشاہ ہے۔ وہ تختِ زر پر ہو جب بھی فقیر ہے۔ دل میں خدا بس رہا ہو تو فقیری و شاہی ہم معنی کلمات ہیں۔ خود آگاہ ہوتا اور ماسوا اللہ کی محبت کا محکوم نہ ہونا عین روحِ اسلام ہے، علامہ اقبال نے کس خوبی سے شعر ذیل میں یہ مسئلہ بیان کر دیا ہے ؎

خودی سے اس طلسمِ رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں
یہی توحید ہے جس کو نہ تُو سمجھا نہ میں سمجھا

قرآنی اخلاق (اور ظاہر ہے کہ وہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق ہیں) ارسطوئی اوسط کے لازماً پابند نہیں۔ "خیر الامور اوسطھا" خود اپنی جگہ عمومی روشن اصول ہے۔ تاہم بعض شعبے ایسے ہیں جو اس اصول سے بے نیاز ہو کر باعثِ سرور و سرشاری بنتے ہیں۔ مثلاً ایثار یعنی دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دینا، یہ ایثار ــــ مالی اور جانی ہر طرح کے مواقع سے تعلق رکھتا ہے، سوال یہ ہے کہ ایثار کے جذبے کا اوسط کیا ہوگا۔ حق و صداقت کی پاسداری اور خدمتِ خلق کے جذبے کی سرمستی کو لیجیے، اس کا اوسط کیا ہوگا؟ حکمِ حق کی تعمیل میں شوقِ جہاد کا اوسط کیا ہوگا؟ حیا سر بسر خیر ہے، حیا کا اوسط کیا ہوگا؟ غرض بہت سے امور ہیں جن میں حسابی اوسط کا اصول نہیں چلتا، کسی بزرگ سے کہا گیا "لاخیرَ فی الاسرافِ" (اسراف میں کوئی خیر نہیں) انہوں

نے جو ب دیا: لا سرف فی خیر (خیر میں کوئی اسراف نہیں) حضرت صدیق اکبرؓ نے ایک جہاد کی تیاری کے موقع پر اپنا سارا حضور نبی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی نذر کر دیا تھا، حضرت صدیق اکبرؓ نے اس صدق کا اوسط لیا ہے!

گویا یوں کہا جا سکتا ہے کہ قرآنی سوچ توازن اور توافق کے مقتضی ہیں جس سے مراد یہ ہے کہ ہر کس مقام یا صورت حال کا تقاضا ہو وہ پورا ہونا چاہیے اور بھرپور انداز میں، مومن کی زندگی سراسر اسی قرآنی توافق و توازن کی عملی تصویر و تفسیر ہونی چاہیئے۔ بقول حضرت علامہ ؎

قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

میزان اور شئے ہے۔ اوسط اور چیز ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ مدت حیات کم ہے۔ کائنات کی عمر کے مقابل اس نازک وجود کی بقا تو جنبش نیزہ کی نسبت بھی نہیں رکھتی۔ پھر تربیت اور تعلیم اور آدمیت کے اکتساب کا مطلب کیا؟ اگر حیات سچ مچ فانی ہے، آدمی مٹی کا پتلا ہے اور اسے مٹی ہی میں مل جانا ہے۔ تو پھر ان لمبے جھگڑوں میں پڑنے سے حاصل؟ زندگی آئین کی پابندی میں گذرے یا دست کے انداز میں گذرے گذر ہی جائے گی۔

کیا حیاتِ آدم واقعی فانی و مہمل ہے؟ یہ بات وہ ہے کہ دلِ آدم میں ہر دم کھٹکتی ہے۔ اسی کے ساتھ اتنی ہی پُر خلش یہ الجھن ہے کہ آدمی مرنے کے بعد سچ مچ زندہ ہو جائے گا؟ قرآن نے بارہا تلقین کی ہے کہ بنو آدم ذمہ دار مخلوق ہیں اور انہیں اپنے اعمال خیر و شر کی جزا و سزا کے لیے بحضور خدا آنا ہے، نیز یہ کہ ہر ایک کو اپنا اپنا اعمال نامہ لے کر اس کیلئے حاضر ہونا ہے جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ زندگی اس ظاہری موت کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی، جیسا کہ پہلے اشارہ ہو چکا، قرآن زندگی کے تسلسل پر روشنی ڈالتا ہے اور زندگی کا تسلسل روحانی ہے، بقول حضرت علامہ ؎

یہ ... ہیں ... سمجھا ہوں ... سے

کہ جان مرتی نہیں مرگ بدن سے

اسی طرح حضرت ... ایک اور مقام پر فرماتے ہیں :

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا

ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

مگر انسان دوبارہ کس طرح زندہ ہوگا؟ قرآن حکیم نے مردہ زمین کی مثال سے سمجھایا ہے جو بارش کی بدولت دوبارہ جان دار بن جاتی ہے اور اس میں **نمو کا جوہر پھر اپنا کمال دکھانے لگتا ہے۔**

"فَانظُرْ إِلَىٰ آثَارِ رَحْمَتِ اللَّهِ كَيْفَ يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ

مَوْتِهَا ۚ إِنَّ ذَٰلِكَ لَمُحْيِي الْمَوْتَىٰ" [1]

[illegible]

... بے شک ... زندہ کرنے والا ہے ...

[illegible]

[illegible]

قرآن حکیم اس طرح دیتا ہے :

"قَالَ مَنْ يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ قُلْ يُحْيِيهَا

الَّذِي أَنشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ" [2]

"وہ ... کہتا ہے کہ ... ہڈیوں ... جب ... بوسیدہ ہو چکی ہوں

گی ... تو ... کہہ دے کہ وہی ... جس نے پہلی

بار عدم سے تخلیق کیا تھا۔"

وہ خدا جس نے آدم کو تخلیق کیا، اس عالم میں ... کچھ ... زیادہ

۱؎ قرآن کریم، سورہ ۳۰، آیت ۵۰

۲؎ " " ۳۶ آیت ۷۹

اللہ آدمی کے بکھرے ہوئے ذرات کو اکٹھا نہیں کر سکتا؟ — بہر حال جو عدم سے وجود میں لا سکتا ہے وہ مُردے کو بھی جلا سکتا ہے، اگر یوں دیکھیں تو قرآن — یہ کتاب زندہ — عالمِ انسانیت کی شکست آرزو کا واحد علاج ہے، مٹ جانے اور ہلاک ہو جانے کا احساس بے یقینی کی پیداوار ہے، اور حق یہ ہے کہ اس احساس نے اس دور کے مادہ پرست انسان اور وجودی فلسفے کے ہزیمت آموز شیوے کے صیدِ زبوں اہلِ دانش کو زندگی کی بے معنویت کے شعور اذیت میں مبتلا کر دیا ہے۔ زندگی کی بے معنویت کا نتیجہ فوری اور طویل المیعاد خودکشی ہے، دوسرا عیاشی، تیسرا آدم بیزاری اور آدم کشی — لب لباب یہ کہ عالمِ انسانیت احترام و مقامِ انسانیت کے شعور سے محروم ہو کر بے یقینی کی لحد میں جیتے جی داخل ہو رہا ہے، مگر وہ شخص جو قرآن پر یقین رکھتا ہو وہ حضرتِ علامہ کی طرح نعرہ زن ہو گا:

جانے کہ بخشند دیگر نگیرند!
آدم بمیرد از بے یقینی!

اور یہ یقین عطیہ ہے قرآن کا، تحفہ ہے اسلام کا۔